بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اسلامی شریعت کی مثال ایک سدا بہار درخت کی سی ہے۔ اساسی عقاید و نظریات اس درخت کی جڑیں ہیں، نصوص سے اس کا تنا بنتا ہے، قانون کے اصول و غایات اس کے بڑے بڑے ٹہنے ہیں، اجماعی فیصلے گویا کونپلیں چھوڑنے والے انکھوے ہیں اور وقتی اور جزئی مسائل و احکام اس کی پتیاں ہیں۔ اس درخت کی جڑیں، تنا اور اس کے ٹہنے اپنی جگہ جوں کے توں قائم رہ کر نشو و نما پاتے ہیں، لیکن اس کی پتیوں میں سے تھوڑی تھوڑی موسمی اثرات کے تحت گرتی رہتی ہیں اور ان کی جگہ نئی پتیاں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔

گویا ہر قانونی نظام کی طرح ہمارے قانونی نظام کا ایک عنصر مستقل ہے، دوسرا تغیر پذیر۔ پہلے عنصر میں صلابت اور جماؤ ہے، دوسرے میں بہاؤ اور سیلان اور لچک ہے۔ پہلا اپنے ذرّے ذرّے کا شدید تحفظ چاہتا ہے اور بدلتے حالات کے سانچوں میں ڈھلنے پر تیار نہیں ہوتا بلکہ وہ سانچوں کو اپنی ساخت کے مطابق بدل لیتا ہے اور نہ بدلیں تو ان کو توڑ ڈالتا ہے، دوسرا عنصر پہلے کے زیر اثر رہتے ہوئے اور بدلتے حالات میں اپنے لیے مناسب جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ پہلا "با زمانہ ستیز" کی فطرت رکھتا ہے، دوسرے کا مزاج "با زمانہ بساز" کا ہے۔ پہلے عنصر سے ہمارا امتیازی ملّی وجود بنتا ہے اور دوسرا اس امتیازی وجود کو مختلف قسم کے ماحول میں پنپنے کے قابل بناتا ہے۔ پہلا عنصر ہمیں اپنے ماضی سے مربوط کرتا ہے اور دوسرا مستقبل کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔

بیک دم ایک پہلو سے جماؤ کی ضرورت ہے، دوسرے پہلو سے بہاؤ کی! ان دوگونہ تقاضوں میں اگر توازن برقرار نہ رہے تو کوئی بھی قانونی نظام بقا و ارتقاء کے قابل نہیں رہتا۔ اگر مستقل عنصر کی صلابت ختم ہو جائے تو قانون کی بنیادیں اور اس کا مجموعی ڈھانچہ برباد ہو جاتا ہے اور اگر تغیر پذیر عنصر کا بہاؤ رک جائے تو اس کا فطری نشو و نما رک جاتا ہے۔

آج ہمارے معاشرے کے اندر دو انتہا پسند اور متضاد رجحانات باہم دگر متقابل ہو کر موجود ہیں اور دونوں اپنا اپنا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ ایک پیچھے کی طرف دیکھتا ہے اور آگے بڑھنے کو تیار نہیں، دوسرا آگے دوڑنا چاہتا ہے مگر پیچھے کوئی تعلق جڑا نہیں رہنے دینا چاہتا۔ ایک جماؤ ہی جماؤ چاہتا ہے اور جزئیات تک کے لیے تغیر پذیری کی گنجائش نہیں دیتا۔ دوسرا بہاؤ ہی بہاؤ چاہتا ہے اور اصول و روایات کے اساسی سرمائے تک کو مستقل نہیں رہنے دینا چاہتا۔ ایک کے سامنے مغربی تمدن کی منزل مقصود ہے اور وہ اپنی قومی خودی، اپنی امتیازی ہیئت اور اپنے جداگانہ وجود تک کو ختم کر کے بگٹٹ اس سمت میں لپک جانا چاہتا ہے۔ دوسرے کو اپنے دین اور اپنے اصول اور اپنی روایات و اقدار کے تحفظ کا سخت اہتمام ہے لیکن وہ نہ جدید حالات اور تقاضوں کی پوری سوجھ بوجھ رکھتا ہے اور نہ اجتہادی ذہن کو کام میں لا کر مسائل حاضرہ کو حل کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ جو کچھ کام ہو چکا ہے وہ سارا دریا برد کر کے نئے سرے سے سوچنا چاہیے، دوسرا کہتا ہے کہ پچھلا سرمایہ فقہ قیامت تک کے لیے تمام جزئیات میں کافی ہے۔ لہٰذا اس پر ذرہ بھر اضافہ کرنے یا اس میں رد و بدل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

جماعت اسلامی بیچ کا وہی نقطۂ نظر پیش کرتی ہے جس کا تقاضا ہمارے قانونِ شریعت کی فطرت کرتی ہے یعنی اس شریعت کا جتنا اصولی عنصر مستقل قدر و قیمت کا ہے اس کا سختی سے تحفظ کرتے ہوئے اس کے اجتہادی عنصر میں جائز اور ضروری حد تک بہاؤ پیدا کیا جائے۔ خصوصاً اب جبکہ پاکستان ایک اسلامی ریاست بننے کی راہ پر پڑ گیا ہے اور جب کہ سرزمینِ پاک میں نظامِ اسلامی کو عملاً برپا کر دینے کا آغاز ہو گیا ہے، ناگزیر ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلے۔ اور بجائے اس کے کہ ضدم ضدا میں پڑ کر غلط طرزِ فکر سے متحرک ہونے والے ہاتھ اسے بے جا طریقے سے کھولیں، چاہیے یہ کہ صحیح طرزِ فکر رکھنے والے عناصر خود آگے بڑھ کر اس کے قفل وا کریں اور پورے انضباط کے ساتھ بتدریج اس کے کواڑ کھولیں۔ مذہبی عناصر کی طرف سے اگر مطلوبہ فکری توازن رو بہ عمل آجائے تو پھر تمام اعتدال پسند عوام کی توجہات اور توقعات کو وہ اپنی طرف سمیٹ سکیں گے اور اربابِ فتنہ کے لیے میدان تنگ ہونے لگے گا۔ ورنہ اگر ہوتے

اب بھی اجتہاد کے دروازے کو بند رکھنے پر اصرار کیا تو زندگی کے عملی مسائل و معاملات کے دباؤ سے فائدہ اٹھا کر غلط طاقتیں سرے سے اس دروازے کو توڑ ڈالیں گی اور اجتہاد کے نام سے پورے دین کا صفایا کر دیں گی۔

ہمارا پارٹ اس معاملے میں یہ بھی ہے کہ ایک طرف تو خود اپنے حلقوں میں دینی اور جدید دونوں قسم کے علوم سے آراستہ ذہن پیدا کیا جائے اور دوسری طرف جدید اور مذہبی طبقوں کو باہم دگر قریب لایا جائے تاکہ وہ اسلامی بنیادوں پر ریاست اور معاشرے کی تعمیر کرنے کے کام میں ایک دوسرے سے تعاون کر سکیں۔ کسی طرح ایک صف کے علمِ دین اور دوسری صف کے علمِ دنیا کو اکٹھا ہونا چاہیے جو ملکی اور بین الاقوامی دائرے میں اب ہمارے سامنے ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے ہمیں اپنی آئیڈیالوجی کی سربلندی اور اپنے اصولِ اساسی اور اپنی مخصوص ذہنی و ملی ساخت کے تحفظ کا پورا اہتمام کرتے ہوئے اجتہادی ذہن سے کام لینا ہے۔ اس کام کے لیے بڑی وسیع علمی استعداد اور بڑے اونچے درجے کی فنی مہارت کی ضرورت ہے۔ اس استعداد اور مہارت کی کمی پورا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ہر طرف سے جمع کریں۔ لیکن قوتوں اور صلاحیتوں کا مجتمع ہونا اور مختلف عناصر کا باہم دگر تعاون کرنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ کم سے کم اساسی نظریہ اور ملی نصب العین کی حد تک یک جہتی پیدا ہو جائے۔ چنانچہ جماعت اسلامی کی دعوتی اور علمی سرگرمیوں کا ایک ہدف یہ بھی ہے کہ رجحانات اور آراء اور نقطہ ہائے نظر کے اختلافات کے باوجود نظریہ و مقصد کے لحاظ سے ساری قوم ایک ہو جائے۔

ہمارا مطالعہ یہ ہے کہ حقیقت پسند علماء اور متوازن ذہن کے جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ایک اچھی خاصی تعداد اسی طرز پر سوچتی ہے۔

لیکن اجتہاد کا دروازہ کھولنے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ قانونِ اسلامی کے عناصرِ ترکیبی اور ان میں سے ہر ایک کی مقصدیت اور قدر و قیمت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

انسان ہر حال میں ایک ایسے بنیادی قانون کا ضرورت مند ہے جس پر تمام تفصیلی اور جزئی ضوابط و احکام استوار ہو سکیں۔ جو مزید قانونی فیصلوں کے لیے ماخذ ہو اور جو سند اور معیار کا کام دے سکے۔ ہمارا بنیادی قانون ان قطعی اوامر و نواہی پر مشتمل ہے جو خدا نے اپنی کتاب اور اپنے رسولؐ کے ذریعے دیئے ہیں۔ اسے ہم الٰہی قانون کہتے ہیں۔ اس قانون کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہ کسی فرد، خاندان، طبقے یا قوم اور قبیلے کا بنایا ہوا نہیں ہے کہ اس میں کسی طرح کی جانب داری کا شبہ کیا جا سکے اور اس کے خلاف کوئی نسلی و وطنی تعصب کارفرما ہو۔ یہ ایک غیر جانبدار اور بے غرض و بے نیاز ہستی کا عطا کردہ ضابطہ ہے۔ اس ہستی کا غیر محدود علم ماضی اور مستقبل کو حاوی ہے اور انسانی دماغ کی کوتاہیوں سے پاک ہے۔ اُس ہستی کا نوعِ انسانی پر فطری اور منطقی حق یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ حکم دے اور اس کے حکم کو بے چون و چرا مانا جائے، کیونکہ وہ پیدا کرنے والا اور زندگی بھر کفالت کرنے والا ہے۔ ان وجوہ سے الٰہی قانون میں ایک انتہائی تقدس پایا جاتا ہے، اس کے لیے عقیدت و احترام کے جذبات کارفرما رہتے ہیں، اس کے موجب خیر و برکت اور ذریعۂ عدل و توازن ہونے پر پورا پورا اعتماد اور بھروسہ پایا جاتا ہے اور اعتقاد، عقل اور افادیت کے سارے اعتبارات سے وہ رضاکارانہ پیروی کا مستحق بنتا ہے۔ یہ الٰہی قانون دراصل ہمارے لیے بنیادی میزانِ عدل اور افکار و اعمال کو جانچنے پرکھنے کی بے لاگ کسوٹی ہے۔ ہمارے پاس یہ ایک ایسا بنیادی ضابطہ ہے جو تمام ملکوں اور زمانوں میں جوں کا توں برقرار رہتا ہے اور خواہشات و جذبات کے انتہائی اشتعال اور مفاد و اغراض کے سخت ترین تصادم میں بھی کسی کی مجال نہیں ہو سکتی کہ اس کے اندر کوئی مداخلت کر سکے۔

انسان کے خود ساختہ قانونی نظاموں میں بڑی کمی یہ ہے کہ نہ انسان سے اعتماد و احترام کے وہ جذبات اپنے حق میں حاصل نہیں کر سکتے جو بدلتے حالات، جذباتی ہیجانات اور مفاد کے تصادم میں ان کا تحفظ کر سکیں۔ آدمی جب کبھی خواہشات، مفاد اور جذبات کے نرغے میں آتا ہے تو اپنے راستے سے وقت کے قانون کی حائل کردہ رکاوٹ کو دور کرنے پر تُل جاتا ہے۔ چنانچہ انسانی قوانین ہمیشہ افراد اور طبقوں اور پارٹیوں کے اہواء و اغراض کا کھلونا بنے رہتے ہیں۔ غیر اسلامی معاشروں کے پاس انسانی

قانون کے جو ترازو، وٹے اور کسوٹیاں اور پیمانے پائے جاتے ہیں، اغراض و خواہشات کے ہاتھوں ان میں بار بار تصرف ہوتا رہتا ہے۔ بخلاف اس کے ہمارے پاس ایسی میزان اور ایسے باٹ ہیں کہ دین کا تقدس و احترام کسی حال میں ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم اپنے معاملات کو ان کے مطابق بنانے کے بجائے خود ان کو ادل بدل ڈالیں۔ اس "قانونِ الٰہی" کے تحفظ کے لیے اعتقاد و ایمان، رائے عام اور حکومت و عدالت کی ساری طاقتوں کو برسر عمل رکھنا ہمارا اہم فریضہ ہے۔ وہ احکام، وہ حدود، وہ ہدایات، وہ فیصلے جو خدا و رسول کی طرف سے بہ حیثیت دین کے ہم کو سونپے گئے ہیں، ان پر ہم صرف اعتقاد و احترام کی نگاہ ڈال سکتے ہیں۔ تنقید کی نہیں۔ ان پر سمعنا و اطعنا کہہ سکتے ہیں۔ ان میں مین میخ نکالنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ ان میں غور و فکر ہم جذبۂ اطاعت سے کر سکتے ہیں، اصلاح جیسے اور ترمیم کرنے کے لیے نہیں! یہ قانونِ الٰہی تو وہ اساسی چٹان ہے جس پر اسلامی نظامِ قانون و فقہ کی ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر یہی متزلزل ہو جائے تو عمارت کہاں کھڑی رہ سکے گی۔

بد قسمتی سے اجتہاد کے فاسد تصور کے علمبردار اس بنیادی الٰہی قانون تک پر ہاتھ صاف کرنے کے ارمان رکھتے ہیں۔ ان کا طرزِ فکر یہ ہے کہ قرآن نے اکثر ضوابط و حدود ایسے بیان کیے ہیں جو عرب کے مخصوص تمدن اور دورِ نبوت کے مخصوص حالات سے متعلق تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اب ہم ان سارے ضوابط و حدود کا بوجھ نسلِ انسانیت پر لادے رہیں۔ رہے ایسے اوامر و نواہی جن میں نسبتہً مستقل قدر و قیمت پائی جاتی ہے، سو ان کی تاویلات کا دائرہ وسیع ہے اور ہر دور کے مناسب حال ان کا کوئی نیا مفہوم معین کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے سامنے سے رسولِ خدا کی توضیحات و تعبیرات کی قطعیت کو ہٹا کر تاویل کی غیر محدود آزادی حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ اس آزادی کا مقصد یہ ہے کہ "تاویل کے دروازے" سے قرآن میں وہ وہ کچھ داخل کر دیا جائے جو اس کے اندر نہیں ہے۔ یہ سارا اہتمام بنیادی الٰہی قانون کو مسخ کر دینے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کو اندازہ نہیں کہ الٰہی قانون کے تقدس و احترام اور انسانی مداخلتوں سے اس کے بالاتر ہونے کی حیثیت کو اگر ایک بار نقصان پہنچا دیا گیا تو پھر اسلامی قانون کے نام سے جو کچھ لایا جائے گا اس کے لیے عقیدت و اعتماد

اور قبول و اطاعت کے جذبات باقی نہ رہیں گے۔

ہمارے قانونی نظام کا دوسرا عنصر ترکیبی رسول اللہ کی سنت ہے۔ سنت دراصل بنیادی قانون کے تقاضوں اور اس کے مقاصد کو واضح کرتی ہے، عملی زندگی کے روزمرّہ مسائل پر اس کے انطباق کا نہج معین کرتی ہے اور تعبیر و توضیح کا ایک رُخ بتاتی ہے۔ سنت بنیادی قانون کی تعبیر و توضیح کے معاملے میں انتشار کے امکانات کا سدّباب کرتی ہے اور اختلافات کو جائز حدوں تک محدود کرتی ہے۔ سنت اُس یک رنگی و یکسانی کے قائم رکھنے کا ذریعہ ہے جسے ہر قانونی نظام اپنے اندر قائم رکھنا چاہتا ہے۔ سنت اس منطقی ربط کو بھی برقرار رکھتی ہے جو قانون کے اصولیات سے لے کر اس کے باریک جزئیات تک میں پایا جانا چاہیے۔ قانونی نظاموں کی فطری ساخت ایک درخت کی سی ہوتی ہے جس کی جڑوں سے لے کر باریک کونپلوں تک سارے اجزا باہم دگر پیوستہ اور باہم دگر موثر و متاثر رہتے ہیں اور درخت کی مجموعی فطرت کے پابند رہ کر اپنا اپنا وظیفہ سرانجام دیتے ہیں۔ یہ سنّت ہی ہے جس کی برکت سے شریعت اسلامیہ کے شجرۂ طیبہ کے سارے اجزا ایک ہم آہنگ نظام میں مربوط رہ کر کام کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی جہالت پر سر دھنیے جنہوں نے اس کے بالکل برعکس یہ پروپگنڈہ شروع کر رکھا ہے کہ سنت ہمارے قانونی نظام میں اختلاف و افتراق کا باعث بنی ہے۔ ان حضرات کو یہ موٹی سی حقیقت سجھائی نہ دے سکی کہ سنّت ماضی و مستقبل کا رشتہ ملاتی ہے اور تاریخ کے سارے ادوار کو جوڑ کر ایک کُل بناتی ہے اور سنت ہی ہے جو زمین کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے مسلمانوں میں فکری وحدت اور تمدنی ہم آہنگی برقرار رکھتی ہے[1]۔ اسی کوتاہ فہمی کے ساتھ یہ حضرات

---

[1] اس حقیقت کو جدید طبقے کے اندر سب سے بڑھ کر اور شاید سب سے پہلے اقبال نے سمجھا وہ مثنوی اسرار و رموز میں واضح کرتا ہے کہ ملت کا اجتماعی وجود قائم ہی نبوت کے فیضان سے ہے۔ فرد کی زندگی تو خدا پر ایمان لانے سے بن سکتی ہے۔ لیکن ملت کا ظہور نبوت کے وسیلے سے ہوتا ہے (باقی برصفحہ آئندہ)

اسلامی قانون کی اس ریڑھ کی ہڈی کو چُور چُور کرنے اٹھے ہیں۔ حالانکہ اگر سنت کا عنصر ایک بار کاٹ دیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نبی کی تربیت، نبی کا اسوہ، نبی کی سنت افراد کو باہم دگر مربوط کر کے اجتماعیت کے پیکر میں لاتی ہے۔ خدا کا رسول وہ مرکز ہے جس کے گرد اشخاص اور طبقے اور قومیں اور نسلیں سمٹ کر ایک وحدت کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ :-

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید — وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
حرفِ بے صوت اندریں عالم بدیم — از رسالت مصرعِ موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما، آئینِ ما!
از رسالت صد ہزار ما یک است — جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس، ہم مدعا گشتیم ما

ان اشعار میں سنت کی اہمیت کا جو شعور مضمر ہے اسے ایک فتنہ زدہ دماغ شاید اخذ نہ کر سکے۔ لیکن اقبالؒ نے سنتِ نبی اور اطاعت نبی کی اہمیت کو "اسرار و رموز" میں بھی اور دوسرے مواقع پر بھی پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو :-

علمِ حق غیر از شریعت ہیچ نیست — اصلِ "سنت" جز محبت ہیچ نیست
تا "شعارِ مصطفیٰ" از دست رفت — قوم را رمزِ بقا از دست رفت
مرشدِ رومی چہ خوش فرمودہ است — آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است
"مگسل از ختم الرسل ایامِ خویش — تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش"
از "مقامِ او" اگر دور ایستی — از میانِ معشرِ ما نیستی
دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم — زیں جہت با یک دگر پیوستہ ایم
رشتۂ ما یک تولائش بس است — چشمِ ما را کیفِ صہبائش بس است
شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو — از "حدودِ مصطفیٰ" بیروں مرو

جائے تو ملتِ اسلامیہ کا شیرازۂ فکر تانا تا پریشان ہو کے رہ جائے گا اور اس جسمِ واحد کا ایک ایک ذرہ ہوا میں بکھر جائے گا۔ ایک زمانہ دوسرے سے اور ایک نسل دوسری نسل سے اور ایک وطن کے باشندے دوسرے وطن کے باشندوں سے ذہنی طور پر منقطع ہو جائیں گے اور نہ ہمارے نظام میں زمانی تسلسل باقی رہے گا، نہ عالمگیریت کی روح اس میں زندہ رہ سکے گی۔ قرآن سے سنت کا پہرہ اٹھ جانے کے بعد جب ہوائے نفس کے تحت الٰہی قانون کی تعبیریں کی جانے لگیں گی تو کسی حکم اور کسی ہدایت کا کوئی مشترک مفہوم باقی نہ رہ سکے گا اور ہمارے مجتہدین

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار" "تا کمندِ تو کند یزداں شکار

معنیٔ دیدارِ آں "آخر زماں" حکمِ او بر خویشتن کردن رواں

در جہاں زی چوں رسولِ انس و جاں تا چو او باشی قبولِ انس و جاں

باز خود را ہیں ہمیں دیدارِ اوست سنتِ او سرّے از اسرارِ اوست

وہ فلسفہ زدہ سیدزادے" کو نصیحت کرتا ہے کہ "دل بہ سخنِ محمدی بند" وہ حضرت میاں میر کی تعریف میں کہتا ہے کہ "بر طریقِ مصطفیٰ محکم پئے"! وہ حضورؐ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ "آنکہ بے او طے نمی گردد سبل"۔ وہ ایک عالمِ دین کو ناقدانہ خطاب میں کہتا ہے کہ "بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست" اور ساتھ ہی انتباہ کرتا ہے کہ اگر یہ نہیں تو پھر جو کچھ ہے "بولہبی" ہے۔ اب یہ پرلے درجے کی ستم ظریفی ہے کہ اس اقبالؒ کو منکرِ حدیث اور مخالفِ سنت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں عائلی کمیشن نے اپنی سفارشات کے نظریاتی حصے میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اقبالؒ محض "کتاب اللہ" کو سرچشمۂ قانون اور سند مانتے تھے۔ کیا ظلم ہے کہ "تشکیلِ جدید" سے ایک اقتباس لے لیا جاتا ہے اور ادھر ادھر نگاہ نہیں جاتی کہ اقبالؒ نے آخر اور کیا کیا کچھ کہا ہے اور خصوصاً بعد میں اس کی فکر نے کیا مستقل شکل اختیار کی ہے۔ یہ ان حضرات کے طرزِ استدلال کی بنیادوں اور اس کے مسالے کا حال ہے۔

نئے نئے اجتہادات میں سے کسی کا رُخ مغرب کی طرف ہوگا کسی کا مشرق کی طرف اور کسی کا شمال یا جنوب کی طرف، اور جس کا جدھر منہ اٹھے گا اُدھر بڑھتا چلا جائے گا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ آخر سنت، رسول اللہ کے اجتہادات اور آپ کی تعبیرات اور آپ کے عدالتی نظائر ہی کا تو مجموعہ ہے۔ پھر کیوں ایک دَور کے اجتہادات، تعبیرات اور نظائر کو دوام دے دیا جائے؟ ان لوگوں کو اندازہ نہیں کہ رسول کے اجتہادات و نظائر کو امت کے مقابلے میں کیا فوقیت حاصل ہے۔ رسول کے متعلق پہلی بات یہ طے ہے کہ شریعت کے علم اور مرضئ الٰہی کے شعور کے لحاظ سے کوئی دوسرا فرد یا گروہ، یا پوری امت مل کر بھی آپ کا مقام نہیں پا سکتی۔ دوسری بات یہ طے ہے کہ اخلاص اور دیانت و امانت اور بے لوث اور بے لاگ ہونے کے لحاظ سے بھی کوئی بڑے سے بڑا مومن و متقی آپ کے ہم پایہ نہیں ہو سکتا۔ تیسری بات یہ واضح ہے کہ آپ نے چونکہ خدا تعالیٰ کی وحی اور ہدایت اور نگرانی اور حفاظت خاص کے تحت کارِ دین سرانجام دیا تھا، لہٰذا آپ کے اجتہادات اور آپ کی تعبیرات اور آپ کے نظائر فساد اور خطا سے پاک ہیں۔ رسول اللہ نے علم و عصمت کی جس بلند ترین مسند پر سے خدا کی مرضیات اور اس کے احکام کو واضح کیا ہے اس پر چونکہ کوئی دوسرا بیٹھنے کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے حضورؐ کے قول و عمل پر خطِ تنسیخ پھیرنے اور اس کے مقابل میں کوئی نئی چیز پیش کرنے کا حق بھی کسی اور کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر (نعوذ باللہ) رسولِ خدا کے علم و اخلاص پر سے کسی کا اعتماد ہی اٹھ گیا ہو اور وہ اپنے یا کسی اور کے علم و اخلاص کو ترجیح دیتا ہو تو ایسے بدبخت کے لیے سرے سے ملت اسلامیہ میں جگہ ہی کہاں ہوگی۔ رہا اجتہاد تو بہت دُور کی چیز ہے وہ تو پورا دین ہی اپنے لیے الگ تصنیف کرے گا، اسے کیا پڑی ہے کہ وہ اسلام کے اندر اجتہاد کرنے بیٹھے۔

سنت کے بعد ہمارے قانونی نظام میں "اجماع" کی بڑی بھاری اہمیت ہے۔ "اجماع"

قانونی معاملات میں ان متفقہ فیصلوں کا اصطلاحی نام ہے جو ملّت کے مختلف مدارسِ فکر کے ماہرینِ قانون کی توثیق و تائید سے وجود میں آئے ہوں۔ اس سلسلے میں اوّلیت کا مقام ان اجماعی فیصلوں کو حاصل ہے جو خلافتِ راشدہ کی مقدس فضا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست علمی و عملی تربیت پانے والے صحابہؓ نے طے کیے ہیں۔ یہ سارے اجماعی فیصلے جو پہلے ہو چکے ہیں اور جو آئندہ ہوں گے تعبیر و تاویل اور اجتہاد و استنباط کے میدان میں ایک دوسرے سے دُور ہٹتے ہوئے اختلافی نقطہ ہائے نظر کو باہم دگر مربوط رکھنے کا وسیلہ ہیں۔ ان فیصلوں کے ذریعے جا بجا ایسے مرکزی نقاط قانون کے میدان میں معیّن ہو جاتے ہیں جن پر آ کر مختلف مدارسِ فکر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ یہ چھوٹا ہوں پر لگے ہوئے نشانات اور سنگ ہائے میل کی طرح ہیں۔ اس بحث سے قطع نظر کہ سلف کے اجماع کو خلف کا اجماع بدل سکتا ہے یا نہیں، اتنی بات مانے بغیر چارہ نہیں کہ اختلافی جزئیات کے مقابلے میں اجماعی فیصلوں کی اہمیت کئی گنا زیادہ ہے اور ان کے بارے میں غیر محتاط رویّہ نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ کسی اجماعی فیصلے سے تعرض کرنے سے پہلے بعد کے مجتہدین کو سو بار سوچنا پڑے گا۔ ورنہ اگر مختلف نقطہ ہائے نظر کا رشتہ ملانے والی ان گرہوں کو بے باکی سے کاٹ ڈالا جائے تو پھر تاویل و استنباط کے اختلافات بلا نہایت ایک دوسرے سے دُور ہوتے چلے جائیں گے۔ نتیجہ انتشار ہو گا۔

اجماعی فیصلوں سے نیچے اُتر کر قانونی معاملات میں نظائر (PRECEDENTS.) کی بھی خاصی اہمیت ہے۔ اس اہمیت کو سمجھنے کے لیے قانونی نظام کی فطرت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ قانون انقلابی جست نہیں لگایا کرتا بلکہ تدریجی طور پر نشو و نما پاتا ہے۔ وہ اصولوں سے فروعات اور کلیوں سے جزئیات پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک درخت کی طرح ٹہنوں سے چھوٹی شاخیں اور شاخوں سے کونپلیں اور کونپلوں سے پتیاں نکالتا رہتا ہے۔ اس کا ارتقا ایک تدریجی تسلسل رکھتا ہے۔ اس میں ہر نئی چیز کسی اصول سے اخذ ہوتی ہے اور مجموعی نظام میں

اسے ایسی جگہ بنا کے دینی پڑتی ہے کہ نہ تو اس سے کوئی اصول مجروح ہو اور نہ دوسرے جزئیات سے وہ ٹکرائے۔ ہر نئے جزئیے کو مجموعی ڈھانچے سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور اس منطقی رابطے کے اندر کھپ جانا چاہیے جو نظامِ قانون کا لازمہ ہے۔ قانون میں نئے جزئیات بالکل اسی طرح رونما ہوتے ہیں جیسے درخت اپنے اندر سے اپنی ضرورت کی نئی پتیاں اپنی مخصوص ساخت کے ساتھ نکالتا رہتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر اس کی اپنی پتیاں نوچ کر کسی اجنبی درخت کی پتیاں اس کی ٹہنیوں کے ساتھ لا لا کر باندھی جانے لگیں یا اس کی شاخ تراشی کر کے بے جوڑ قسم کی شاخیں اس کے تنے پر اڑس دی جائیں تو وہ سارے کا سارا تباہ ہو کے رہ جائے گا۔ اس طرح بے جوڑ اصول و مقاصد اور اجنبی قسم کے جزئیات اگر کسی قانونی نظام میں زبردستی ٹھونس دیئے جائیں تو وہ اس کے پورے ڈھانچے کا ستیاناس کر کے رکھ دیں گے۔ قانون کے مزاج کی یہی خصوصیت ہے جو نظائر کی اہمیت پیدا کرتی ہے۔ علمائے قانون، جج اور قاضی، مفتی اور وکلاء کوئی فیصلہ دینے اور رائے قائم کرنے سے قبل پیچھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اب تک قانون نے کیا کیا سنگ ہائے میل نصب کیے ہیں اور کیا کیا نقوش پا ثبت کیے ہیں۔ پچھلے نظائر سے بے نیاز ہو کر قانون میں اندھا دھند رائے دینے اور فیصلے کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ بے جوڑ اور باہم دگر متصادم فیصلوں اور آراء کو اپنے اندر جمع کرے اور اس کا ارتقائی تسلسل اور اس کا منطقی ربط بالکل تباہ ہو کے رہ جائے۔ علاوہ بریں کسی قانونی نظام کو جو معاشرہ لے کے چل رہا ہوتا ہے اس کے اندر اپنے ہاں کے قانونی روایات و نظائر سے ایک ذہنی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ وابستگی مسلمانوں کے اندر قانونِ شریعت کے لیے زیادہ گہری قسم کی ہے۔ معاشرے کے تاثرات کا لحاظ کیے بغیر اگر کچھ لوگ قانونِ شریعت کا سارا ڈھانچہ مسخ کر دینے والے انوکھے فیصلے کرنے پر اتر آئیں تو ان فیصلوں کو عملاً قبول کون کرے گا اور یہ نافذ کن لوگوں پر کیے جا سکیں گے۔ قانون میں اب تک جو فکری ارتقاء ہوا ہے اور ملت کے معتمد علیہ ائمہ و مفکرین نے عرق ریزیوں کا جو علمی حاصل ہمارے لیے چھوڑا ہے

اور جس کے استدلال کے ساتھ پوری پوری سازگاری ہمارے اجتماعی ذہن نے پیدا کرلی ہے، اسے پاؤں تلے روند کر ایک نئی شریعت گھڑنے پر کون ہو گا جو "متحرک اسلام" کے مجتہدین کے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ بالکل ناگزیر ہے کہ نئے فیصلے کرنے سے قبل پچھلے فیصلوں کا باریکی سے جائزہ لیا جائے اور کسی نئی بات کو سامنے لانے سے قبل یہ اطمینان کرلیا جائے کہ قانون کے مجموعی ڈھانچے سے یہ ہم آہنگ ہو سکے گی یا نہیں۔ قانون اپنے ارتقاء میں جس تدریجی تسلسل اور جس منطقی ربط کو چاہتا ہے اسے برباد کر دینے کا نام اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ ایسا اجتہاد تو اس کی جڑیں کھود کے رکھ دے گا۔

مختصر یہ کہ کسی بھی قانونی نظام میں اجتہاد بچوں کا کھیل نہیں ہوتا کہ ہر تیز دماغ قلم رساں اس کی مسندِ جلیلہ پر جلوہ فرما ہو جائے، کجا کہ معاملہ شریعتِ اسلامی کا ہو جس کے ساتھ کروڑوں بندگانِ خدا کی دنیا بھی اور آخرت بھی بندھی ہوئی ہے۔ اس منصب پر آنے کے لیے کسی خاندان یا نسل یا طبقے سے نسبت کی ضرورت نہیں، لیکن قانون کے تمام عناصر، تمام اصول اور تمام اجزاء اور ان کے باہمی ربط کی ماہرانہ بصیرت ضرور درکار ہے۔ اجتہاد سے پہلے اکتساب کی ضرورت ہے۔ اگر امریکہ کی عظیم ایٹمی تجربہ گاہ میں ہر اناڑی کو گھومتے پھرنے اور مداخلت کرنے کا حق دے دیا جائے تو جتنا بُرا نتیجہ اس حماقت سے رُونما ہو گا اس سے ہزار گنا زیادہ بُرا نتیجہ شریعتِ اسلامیہ کے پیچیدہ اور باریکی دار نظام میں اَن گھڑ ذہنوں کو طبع آزمائی کا اذن دے دینے سے شریعت اور ملت کے حق میں رونما ہو سکتا ہے۔

اجتہاد کے لیے بہر حال معتمد علیہ شخصیتوں کی ضرورت ہے۔ اسی لیے ہمارے علومِ قانونیات میں مجتہد کے لازمی اوصاف اور شرائطِ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے بحثیں کی گئی ہیں۔ ان بحثوں کا اگر اصل مغز سامنے رکھا جائے تو اجتہادی فیصلے صرف ایسے لوگوں کے ذریعے ہونے چاہئیں جو حسبِ ذیل پہلوؤں سے ملت کا اعتماد حاصل کر سکیں:۔

—— ان کی علمی استعداد کے بارے میں یہ اطمینان پایا جانا چاہیے کہ یہ قانونِ شریعت کے پورے سسٹم کو جڑ سے لے کر کونپلوں تک سمجھتے ہیں اور ان کا باہمی ربط جانتے ہیں اور پیش آمدہ مسائل میں ماہرانہ رائے دے سکتے ہیں۔

—— ان کے کردار کے بارے میں عوام کو یہ بھروسہ ہونا چاہیے کہ یہ خدا ترس اور با اخلاص اور دیانت دار لوگ ہیں، ان کے اندر دین اور اس کے قانون سے انحراف کا جذبہ کارفرما نہیں ہے، یہ شریعت کے اندر اپنی اغراض و اہواء کو دخیل کرنے والے نہیں ہیں اور ان کے کچھ اپنے طبقاتی اور گروہی تقاضے ایسے نہیں ہیں کہ جن کو یہ خدا اور رسول کا نام لے کر اجتہاد کے عنوان سے ہمارے سر منڈھ دیں۔

—— ان کی ذہنی و فکری ساخت کے بارے میں عام مسلمانوں کے اندر یہ اندیشہ موجود نہ ہونا چاہیے کہ وہ کسی غیر اسلامی فکر و تہذیب سے مرعوب اور کسی کافرانہ نظامِ قانون کے مفتوح ہیں اور وہ اجتہاد کی مسند پر بیٹھ کر شریعت کے ڈھانچے میں اجنبی اور متضاد نظریات، اصول اور جزئیات کو داخل کر دیں گے اور اسلامی قانون میں تحریف کر ڈالیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ منصب اجتہاد کے لیے ایسے دل و دماغ کو کوئی بھی قانونی نظام —— اور علی الخصوص اسلام —— موزوں اور اہل قرار نہیں دے سکتا جو اغیار کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو۔ ذہنی غلامی اور اجتہاد میں باہمی منافات ہے۔ کہنے والے نے خوب کہا کہ "محکوم کے الہام سے اللہ بچائے"۔ کہنا چاہیے کہ اغیار کے ذہنی غلاموں کے اجتہاد سے اللہ بچائے۔

ان صفات سے عاری لوگ اگر اجتہاد کی مسندوں پر بیٹھنے لگیں —— چاہے یہ مسندیں کسی کمیشن کے نام سے حکمران پارٹی نے اپنے دستِ مبارک سے کیوں نہ بچھائی ہوں —— تو عوام ان کے کیے ہوئے کام سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے اور نہ وہ ان قانونی تبدیلیوں کو شرح صدر سے قبول کر سکتے ہیں جو ایسے غیر معتمد مجتہدین نے تجویز کر کے دی ہوں۔ ان کے کارناموں کو ہمیشہ شک و شبہ سے دیکھا جائے گا اور ان کی مداخلتوں کو لازماً دین میں مسخ اور تحریف کا ہم معنی سمجھا جائیگا۔

قانونِ شریعت کی مقدس اور پیچیدہ مشینری کو متحرک کرنے کا کام کبھی ایسے لوگوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا جن کی معلومات عامیانہ درجے کی ہوں، جن کی پوری عملی زندگی اسلام کے تقاضوں سے بغاوت اور فرار کی شہادت دے رہی ہو، جن کے بارے میں یہ بات معلوم عام ہو کہ وہ غیر اسلامی فکر و تہذیب کے سامنے مفتوح ہو چکے ہیں اور باہر سے لا لا کر اجنبی چیزوں کو اسلام کے ڈھانچے میں نصب کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اور جن کے نزلے تصور اسلام کو ملتِ اسلامیہ کا اجتماعی ذہن قبول نہیں کر سکتا۔[1]

صحیح طریق کار یہ ہے کہ ہم اپنے اندر سے ایک طرف ایسے معتمد علیہ علماء کو لیں جو اسلامی قانون کے ماہرانہ علم کے ساتھ جدید حالات و ضروریات کا شعور رکھتے ہوں، اور دوسری طرف

---

[1] یہی وجہ ہے کہ دورِ زوال و فساد میں جبکہ اسلامی نظام برطرف ہو گیا ہو اور غلط قسم کی قیادت برسرِ اقتدار آ جائے اور دین و شریعت کے معاملات غیر ذمہ دار ہاتھوں میں چلے جائیں، علماء کی ایک بڑی تعداد نے اجتہاد کے دروازے کا بند رکھا جانا لازم قرار دیا ہے۔ ان کے استدلال میں اتنا وزن تھا کہ علامہ اقبال مرحوم نے بھی اسے قبول کر لیا، وہی اقبالؒ جو "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" میں اجتہاد کا نہایت جاندار اور خطرناک تصور پیش کرتا ہے، مثنوی اسرار و رموز میں تلقین کرتا ہے کہ:

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط	قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر	اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است	معنیِ تقلید ضبطِ ملت است

آج جو مدعیانِ اجتہاد "تشکیلِ جدید" کے اقتباسات استعمال کر رہے ہیں ان سے درخواست ہے کہ وہ ذرا اس "رجعت پسند" اور "ماضی پرست" اقبالؒ کو بھی پڑھیں جس نے پختگیِ فکر کے مقام تک آتے آتے تشکیلِ جدید کے اکثر مباحث کی خود ہی تردید کر دی ہے۔ ان حضرات نے اقبال کی اسی ایک کتاب کو آخر کیوں اپنے لیے چراگاہ بنا لیا ہے۔

جدید تعلیم یافتہ طبقے میں سے ایسے مخلص افراد کو چھانٹ لیں جو دورِ حاضر کے مسائلِ حیات کا تحقیقی مطالعہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلام سے وفاداری رکھتے ہوں اور کم سے کم اسلامی قانون کے عناصر ترکیبی اور ان کے باہمی ربط اور ان میں سے ہر ایک کی قدر و قیمت کو جانتے ہوں۔ دونوں صنفوں میں سے وہی لوگ اس نازک فریضہ کو سرانجام دینے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں جو انتہا پسندانہ ذہن کے ساتھ باہم دگر نفرت اور کشمکش رکھنے کے بجائے ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے اہل ہوں۔ بروئے دستور جو کمیشن موجودہ قانونی نظام کو اسلام کے مطابق بدلنے کا منصوبہ بنانے کے لیے مامور کیا جانے والا ہے، اس کے ارکان کا انتخاب کرنے میں اگر اسی معیار کو سامنے رکھا جائے تو نہایت اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ صدرِ ریاست سے ہم اس غلطی کی توقع نہیں کرتے جو عائلی کمیشن کی ترتیب میں کی جا چکی ہے اور جس کے زریں کارنامے پر سارا ملک نفرین بھیج رہا ہے۔

نئی کتابیں چھپ کر آگئیں

توضیحات مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی ایک نہایت جامع کتاب جس میں مختلف موضوعات پر مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں۔ آیاتِ قرآنی کی تعبیر و تشریح۔ حدیث اور سنت اور اس کے بارے میں جماعتِ اسلامی پر کیے جانے والے اعتراضات کا مدلل اور مسکت جواب اور بعض معاشی اور معاشرتی مسائل مثلاً پردہ، مسئلہ تملیک اور زکوٰۃ۔ اسلام میں شوریٰ اور قانون سازی کی صحیح نوعیت اور اسی طرح کے بعض دوسرے اہم مسائل پر مولانائے موصوف کے قلم سے نہایت زوردار اور شگفتہ مضامین شامل ہیں۔ قیمت: ساڑھے تین روپے

انسانیت کی تعمیرِ نو اور اسلام پروفیسر عبدالحمید صدیقی کی نہایت قیمتی علمی کاوش جو ان کے وسیع مطالعہ کا نچوڑ اور علم و تحقیق کے میدان میں ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ پروفیسر صاحب نے وقت کے مختلف نظامہائے فکر کا گہرا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد ان کی خامیاں اور نقائص نمایاں کئے ہیں اور اسلام کو بہترین نظامِ زندگی ثابت کیا ہے۔ قیمت: ساڑھے تین روپے

مولانا عبدالغفار حسن صاحب کا مرتب کردہ مجموعہ احادیث

عنقریب طبع ہو کر آنے والا ہے

ملنے کا پتہ: **مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی پاکستان۔ اچھرہ۔ لاہور**